شہنیلا نازنین
پی ایچ ڈی اسکالر
شعبۂ اردو، جامعہ کراچی
ڈاکٹر تنظیم الفردوس
صدرنشیں
شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

مولانا ظفر علی خان کی شاعری میں
شہروں کے اسمِ معروفہ دیوان ''چمنستان'' کے تناظر میں

ABSTRACT

Maulana Zafar Ali Khan's poetry about "Cities" in the light of Dewan "Chamanistan".
By Shehnila Nazneen, Research Scholar, Department of Urdu, University of Karachi
Prof. Dr. Tanzim-ul-Firdous, Head of Urdu Department, University of Karachi.

Maulana Zafar Ali Khan was not only a combustible speaker, great writer, eloquent and prolific poet but also played a very important role in Pakistan making. Making his struggle for Pakistan more efficient and effective, he traveled various cities of United India tumultuously and riotously, where he extemporary recited political, expressional, and accidental poetry on the Western world at public and private gatherings.

The usage of proper nouns in these poetries shows the political and social state of that time. Moreover, the aesthetic use of these specific nouns acceptably motivates the nation.

In this article, some additional details are provided about the poetry of Deewan-e-Chamnistan with their poetic references.

اُردو شاعری کی تاریخ میں چند ہی شعراء کرام ہیں جن کے کلام میں ذخیرہ الفاظ کی وسعت بہت زیادہ ہیں۔نظیر اکبرآبادی، علّامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، مولانا ظفرعلی خان اور دیگر شامل ہیں۔شعرائے کرام کے لفظیات کچھ کائناتی نوعیت کے ہوتے ہیں کچھ سماجی اور کچھ ذاتی نوعیت کی ہیں۔ یہ لفظیات اسمائے معرفہ کا روپ دھار لیتے ہیں اور یہ اسمائے معرفہ بعض اوقات تلمیحات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہر نام کے ساتھ مختلف کردار و واقعات تاریخ کا حصّہ بن کر کلام کا حُسن نکھارتے اور اسے معنی خیز بناتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خان معروف مصنّف، مترجم، شاعر اور صحافی تھے۔ تحریکِ پاکستان اور تحریکِ خلافت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ نے لاہور سے معروف اُردو اخبار ''زمیندار'' جاری کیا اور ''بابائے اُردو صحافت'' کہلائے۔ قومی اور سیاسی تحریکات میں عملی حصّہ لیا۔

مولانا ظفر علی خان ۲۷ ذی القعد ۱۲۹۰ھ کو میرٹھ، ضلع سیالکوٹ، تحصیل وزیر آباد (پنجاب) میں پیدا ہوئے تھے[۱] اور اس کی مطابقت ۱۷ جنوری ۱۸۷۴ء سے ہوتی ہے۔ والد کا نام سراج الدین خان تھا جو وزیر آباد کے تحصیل کرم آباد کے ایک زمیندار تھے اور ڈاک وتار کے محلّے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ظفر علی خان نے ابتدائی تعلیم وزیر آباد سے حاصل کی اور پٹیالہ سے میٹرک کیا پھر علی گڑھ سے ۱۸۹۵ء میں بی اے کیا۔[۲] علی گڑھ میں علّامہ شبلی نعمانی، پروفیسر طامس آرنلڈ اور ماریسن جیسے نامور اہلِ علم ان کے اُستادوں میں شامل تھے۔ مولانا شبلی سے حیدر آباد دکن کی ادبی و علمی سرگرمیوں کا ذکر سُن کر وہیں چلے گئے۔[۳]

ریاست حیدر آباد (دکن) میں انھوں نے مختلف عہدوں میں تقریباً ۱۳ برس کام کیا۔ انھوں نے بمبئی میں میر محفوظ علی بدایونی کے ساتھ مل کر تجارت بھی کی۔[۴] علی گڑھ کے علاوہ حیدر آباد (دکن) کے قیام نے بھی ظفر علی خان کی شخصیت سازی پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ لیکن حیدر آباد (دکن) میں درباری سازشیں بھی بہت تھیں اور اسی کے نتیجے میں ۱۹۰۹ء میں انھیں ریاست چھوڑنے کا حکم ملا۔[۵] پنجاب واپس پہنچے تو ان کے والد شدید علیل تھے۔ ان کے والد نے ۱۹۰۳ء میں ''زمیندار'' اخبار جاری کیا۔[۶] والد کے انتقال کے بعد ظفر علی خان نے اخبار ''زمیندار'' کی ادارت سنبھالی اور ایک طویل عرصے تک اس اخبار کے ذریعے برِّعظیم پاک و ہند کی سیاست اور صحافت میں اہم کردار ادا کیا۔[۷]

مولانا ظفر علی خان نے اپنی زندگی قوم وملّت ومُلک کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔ مولانا ظفر علی خان نے ایک ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ قومی اور سیاسی تحریکات میں عملی حصّہ لیا۔ سیاست اور صحافت میں حق گوئی اور بے باکی کے سبب مشکلات کا سامنا کیا اور خاصہ طویل عرصہ مُلک وقوم کی آزادی کے لیے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ وہ جرأت مند صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شعلہ بیاں مقرّر، بہترین ادیب اور پُرگو شاعر بھی تھے۔ مولانا ظفر علی خان اُردو زبان پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ الفاظ کو خلاقی سے استعمال کرنا، ان کو مختلف معنوں میں اور دلچسپ قافیوں کے طور پر برتنا ان کا خاص فن ہے۔

لہٰذا میں نے مولانا ظفر علی خان کے دیوان ''چمنستان'' سے شہروں کے اسمائے معرفہ کی فہرست تیار کی ہے۔ کسی بھی شاعر کے کلام میں شہروں کے اسمائے معرفہ بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان سے تواریخ، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت طرز بود و باش، رہن سہن اور دیگر عوامل کا علم ہوتا ہے۔ جو وقت کے دُھول میں دب چکے ہوتے ہیں لیکن شاعر کے کلام کے ذریعے زندہ وجاوید ہوجاتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کے کلام میں شہروں کے ناموں کی وجہ سے ہمیں اس عہد کے زبان و بیان، الفاظ ومعنیٰ کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ جو اَب متروک یا معدوم یا پھر نئے آہنگ و انداز کے ساتھ موجود ہیں۔

بیسویں صدی میں اُردو زبان کے بیشتر شعرائے کرام کے کلام میں عربی، فارسی، سنسکرت کے کلمات و الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں جس سے اُردو اَدب کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوا ہے۔شعرائے کے کلام میں اسرار و رموز اور معنی ومفہوم کو سمجھنے کے لیے اس کے عہد کے معاشی، معاشرتی، تمدّنی اور سیاسی عناصر کو سمجھنا ضروری ہے۔ چوں کہ بیسویں صدی میں سیاسی و ادبی منظر نامہ تیزی سے تغیّر پذیر تھا۔لہٰذا سیاسی جلسے کی گونج، مختلف تاریک کا احوال، مذہبی تفرقہ کی بازگشت سے شعراء کا کلام بھی متاثر نظر آنے لگا۔لیکن صدی گزرنے کے بعد عہد گزشتہ کی شخصیات، اخبارات رسائل و جرائد، شہروں کے اسما وغیرہ جو شعراء کے کلام میں مستعمل ہیں۔موجودہ عہد کے قاری کے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔اس ذیل میں ان کی تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ کلام کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔یوں تو ہر لفظ اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔بقول وحید الدین سلیم:

> ہر لفظ ایک آوازی اشارہ ہے جو خیالات کے ایک بڑے مجموعے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔(۸)

جہاں تک لفظوں کی بات ہے تو کچھ لفظ تلمیح کی صورت اپنے عہد کی داستان کو بیان کرتے ہیں۔اسی طرح کچھ شہروں کے نام کچھ رسائل و اخبار کے نام شہرت کی بنا پر خاص ہوجاتے ہیں۔جیسے اقبال کی وجہ سے سیالکوٹ، قطب مینار کی وجہ سے دلّی، تاج محل کی وجہ سے آگرہ، غالب کی وجہ سے اُردو، علی برادران کی وجہ سے تحریکِ خلافت، ظفر علی خان کی وجہ سے زمیندار۔اس ذیل میں شاہد احمد دہلوی نے کہا تھا کہ ''ہاپڑ کے پاپڑ اور مولوی نذیر احمد دہلوی بہت مشہور ہیں۔''

مولانا ظفر علی خان کی وجہ شہرت تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی ہند بھی ہے۔مولانا نے قومی اور سیاسی تحریکات میں عملی طور پر حصّہ لیا۔تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں عملی اور قلمی طور پر اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔اس ذیل میں آپ نے متحدہ ہندوستان کے مختلف شہروں اور دیہات کا نہ صرف سفر کیا بلکہ ان علاقوں کو اپنی شاعری کا حصّہ بنایا اور ان شہروں اور گاؤں کے اسمِ معرفہ کے نام سے بیشتر نظمیں لکھیں جو ایک تاریخی دستاویز کی اہمیت کی حامل ہیں۔

ا۔امرتسر

برِّصغیر پاک و ہند کے ادب، سیاست، طب، ثقافت، تہذیب وتمدّن، تہذیبی روایات اور اعلیٰ اقدار میں امرتسر بہت اہمیت کا حامل شہر ہے۔مختلف شعبۂ ہائے زندگی کی نابغۂ روزگار ہستیوں کا تعلق اس مردم خیز خطے سے ہے جن میں صوفی غلام مصطفی تبسّم، حکیم محمد ابراہیم جالندھری، علّامہ عبداللہ عمادی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، علّامہ عنایت اللہ مشرقی، علّامہ محمد حُسین عرشی اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔(۹)

عبدالحمید نے اپنی کتاب ''امرتسر کی یادیں'' میں لکھا ہے کہ ''یہ شہر ہندوستان کا قرطبہ تھا اور اس کا کمپنی باغ اس کا الحمرا تھا۔''(۱۰)

یہ شہر انگریزی سرکار سے لے کر قیامِ پاکستان تک علم و اَدب کا بڑا مرکز تھا لیکن یہاں کے مسلمان پاکستان کی سرزمین پر آباد ہوئے تو اس کی رونق ویرانی میں بدل گئی۔[11] کیوں کہ برطانوی قانون آزادی ہند کے تحت ہندوستان اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور بھارت میں تقسیم ہوا تو امرتسر شہر پر بلحاظ آبادیات، معاشیات، ثقافت، سیاسی اور سماجی ڈھانچے پر گہرا اثر پڑا۔ صوبہ پنجاب (برطانوی ہند) کی پاکستان اور بھارت میں تقسیم پر امرتسر ایک سرحدی شہر بن گیا۔ مسلم لیگ امرتسر کو لاہور سے ۳۰ میل کے فاصلے اور تقریباً ۵۰ فیصد مسلم آبادی کی وجہ سے پاکستان میں شامل کرنا چاہتی تھی، لیکن امرتسر شہر کو بھارت کا حصّہ بنا دیا گیا۔ جس کی وجہ سے اس شہر کو تقسیم کے دوران بدترین فرقہ وارانہ فسادات کا سامنا کرنا پڑا اور یہاں کے مسلم رہائشی، مسلمان مخالفت فسادات کی وجہ سے اپنا گھر بار املاک کو چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہو گئے۔[12] امرتسر میں اہم مسلم اکثریت دیہات سلطان پور، کالا افغانہ، عبدل کلاں، رشید بال، لاہوریے شاہ پور، شاہ کوٹ، علی پور، علی وال، اللہ آباد، فتح آباد، چک گوزہ، چک جٹاں اور چیمہ شامل تھے۔[13]

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزوں اور سکھ حاکم میاں گلاب چند المعروف گلاب سنگھ کے مابین پہلی سکھ انگریز جنگ کے بعد ایک معاہدہ ہوا جسے معاہدہ امرتسر یا امرتسر سیل ڈیڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کے تحت گُلاب سنگھ نے دریائے سندھ کے مشرق میں موجود تمام پہاڑی علاقے جب کہ راوی کے مغرب میں موجود علاقے (بشمول چھمبا) پچھتّر لاکھ روپے کے عوض خرید لیا۔ یوں جموں کشمیر کا پورا علاقہ ڈوگرا تسلّط میں آ گیا۔[14]

اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل سر ہنری یارڈنج نے ۲ مارچ ۱۸۴۶ء میں اپنی بہن کو لکھے ایک خط میں گلاب سنگھ کو ''ایشیا کا سب سے بڑا بدمعاش'' کہہ کر متعارف کروایا۔ گلاب سنگھ اور اس کی ڈوگرا سلطنت نے سو سے زیادہ برس کشمیر پر حکومت کی یہ ایک بادشاہت پر مبنی مطلق العنان نظام تھا جس میں لوگوں پر بہت ظلم ہوئے۔[15]

موجودہ عہد میں یہ بھارت کے صوبہ پنجاب کے ۲۲ اضلاع میں سے ایک شہر ہے۔ جسے مقامی پنجابی تلفظ میں امبر سر بھی کہا جاتا ہے۔ امرتسر شہر میں سکھ مت کا رُوحانی مقام ہرمندر صاحب واقع ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان پنجابی اور انگریزی ہے۔ امرتسر کے لیے پُرانے نام رام داس پور، گرو چک اور رام داس چک بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔[16]

مولانا ظفر علی خان ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو جامعہ اسلامیہ امرتسر معائنہ کیلئے گئے۔ جہاں مولوی محمد عمر صاحب ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول کے صاحبزادے عزیز نصر اللہ خان نے جامعہ کے ایک قرطاس پر فی البدیہہ اشعار کی فرمائش کی:

کس آسانی سے آ جاتے ہیں نصر اللہ کے دام میں ۔۔۔ بڑے ہی بھولے بھالے ہیں مسلمانانِ امرتسر
ڈریں گے کیا کسی فرعون بے ساماں کی دھمکی سے ۔۔۔ خدا سے ڈرنے والے ہیں مسلمانانِ امرتسر
ہرا جس ابرِ رحمت نے کیا بطحا کی کھیتی کو ۔۔۔ اسی بادل کے جھالے ہیں مسلمانانِ امرتسر

(نظم: مسلمانانِ امرتسر، دیوان: چ، ص ۶۰)

۲۔امروہہ

اس شہر کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اسلامی عہد سے قبل بھی یہاں باعظمت، علماء وفضلاء موجود تھے۔ مشہور مسلمان مؤرّخ مسعودی ۹۱۵ء میں ہندوستان آیا۔[۱۷] اسلامی عہد میں سپہ سالار مسعود غازی نے امروہہ اور سنبھل کے قلعے فتح کیے۔[۱۸] سلطان التمش نے حکمران بننے کے بعد امروہہ اور بدایوں میں الگ الگ حاکم مقرّر کیے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں یہاں دہلی کی حکومت کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۳۴۰ء میں ابنِ بطوطہ امروہہ پہنچا۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامے (سفرنامہ ابنِ بطوطہ، ص ۲۲۹) میں اس شہر کے متعلق کہا ہے۔ ''ھی بلدۃ صغیرۃ حسنۃ'' یعنی ایک چھوٹا خوب صورت شہر جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہاں کی چہل پہل تہذیب وتمدّن کے معترف نظر آتے ہیں۔[۱۹]

اس شہر کی عظمت وشہرت کا باعث امروہہ کے سادات ہیں۔ ہندوستان کے تمام سادات میں امروہہ کے سادات اہم مقام رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''آئینِ اکبری'' میں ''امروہہ کے سیّد ہندوستان کے مشہور خاندانوں میں سے ہیں۔'' عہدِ اکبری میں ۲۸۴ منصب دار سادات امروہہ سے تھے۔[۲۰] سادات امروہہ کی وجہ سے یہ سرزمین علم واَدب اور شعروسخن کا بھی مرکز رہی ہے۔ بقول رئیس امروہوی:

> جہاں تک شعرائے امروہہ کا تعلق ہے تو بلا شبہ دو ہزار صفحے کی ایک کتاب اس موضوع پر لکھی جاسکتی ہے۔[۲۱]

آبِ حیات میں آزادؔ نے مصحفی کے باب میں جب مصحفی کی زبان کا ذکر کیا تو اس میں ''امروہہ پن'' بتایا ہے جو امروہہ کی انفرادیت کو تسلیم کا ثبوت ہے۔[۲۲]

اُردو شاعری میں دکن کے بعد دہلی اور لکھنؤ کو داستان کا مقام حاصل ہے۔ امروہہ ان دونوں مقام کے درمیان واقع ہے۔[۲۳] شعرائے امروہہ کو بادشاہوں، نوابوں اور راجاؤں کے دربار میں بھی بڑی عزت حاصل رہی مثلاً اسمٰعیل امرہوی، اورنگ زیب کے عہد میں دکن میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ نواب واجد علی شاہ کے دربار میں حافظ سیّد محمد اسمٰعیل حافظ امرہوی کو عزت ووقار حاصل تھا۔ ریاست رامپور میں نواب حامد علی خان کے دربار سے حضرت شمیم امرہوی کو ''فرزدقِ ہند'' کا خطاب ملا۔[۲۴] اس کے ساتھ ہی بہت سے شعرائے امروہہ کو اساتذہ شعراء سے قربت رہی۔ مثلاً امیر اللہ صوفی، اُستاد ذوق کے شاگرد، عامل امرہوی صادق امرہوی، اُستاد داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ سراج الدین احمد سراج امرہوی کو میرانیس سے شرف تلمذ تھا۔ امیر مینائی کے شاگرد سیّد احمد نذر امرہوی تھے جو بعد میں نواب کلب علی خان رامپور کے اُستاد بنے۔ خدائے سخن میر تقی میر نے میر سعادت علی سعادت امرہوی کی صحبت میں ریختہ کی طرف متوجہ ہوئے۔[۲۵] مصحفی کے مولد ہونے کا شرف بھی امروہہ کو حاصل ہے۔ شمالی ہند میں اُردو کا سب سے بڑا شاعر سیّد اسمٰعیل امرہوی کا تعلق بھی امروہہ سے تھا۔[۲۶] امروہہ شہر نے جہاں غزل گو اور مثنوی نگار اساتذہ پیدا کیے وہیں دہلی اور لکھنؤ کے مرثیہ نگاروں کو بھی جنم دیا۔

عصرِ حاضر میں نسیم امرہوی۔ مشہور خطاط وشاعر صادقین، جون ایلیا، رئیس امرہوی، ڈاکٹر ہلال نقوی کا تعلق امروہہ سے ہے۔(۲۷)

موجودہ بھارت میں امروہہ ہندوستان کی شمالی ریاست اُتر پردیش کا مردم خیز شہر ہے۔ امروہہ اب بھی ایک مسلم اکثریتی آبادی ہے۔ ساٹھ فیصد آبادی مسلمان ہے اور تیس فیصد ہندو ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان اُردو، ہندی اور انگریزی ہے۔(۲۸)

اگر مینہ زور سے برسا تو گل جائیں گی دیواریں | کہ اینٹیں ساری کچی ہیں بشیر احمد کے بھٹے کی
مسالہ پیتے ہیں جس پہ وہ بے دانت کی سِل ہے | نہ کچھ بھی چل سکی ان کانگرس والوں کے بٹے کی
لیا شوکت علی نے ہاتھ میں اسلام کا ڈنڈا | میں جب جانوں سہیں اِک چوٹ بھی اس لیے کٹے کی

(نظم: حلقۂ امروہہ کی انتخابی آویزش، دیوان: چ، ص ۱۰۴)

۳۔ بھاگل پور

یہ شہر ہندوستان کی تاریخی ریاست بہار جو دریائے گنگا کے جنوبی کنارے واقع ہے۔ اس کے اڑتیس اضلاع میں سے ایک ضلع ہے۔ یہ بہار کی آبادی کے لحاظ سے تیسرا بڑا شہر ہے۔ بھاگل پور کا رقبہ ۱۱۰ مربع کلومیٹر ہے اور اس کی موجودہ مجموعی آبادی ۷۵۳،۲۲،۶ افراد پر مشتمل ہے۔ بھاگل پور ڈسٹرکٹ انتظامی لحاظ سے اس شہر کا ہیڈکوارٹر ہے۔(۲۹)

یہ شہر صنعت وحرفت کے میدان میں ممتاز اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا اس کو ایٹم کا شہر" Silk City جاتا ہے۔ اس شہر میں بہنے والے دریائے گنگا میں پائی جانے والی ڈولفن کو بلائنڈ ڈولفن کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ قدرتی طور پر گدلے پانی میں بستی ہے، برسوں یہاں رہنے سے وہ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوچکی ہے۔ دریائے گنگا میں ڈولفن کی آبادی کا تناسب تقریباً پینتیس سو سے پینتالیس سو ہے اور اس تعداد میں مسلسل کمی ہورہی ہے۔ حال ہی میں بھارتی حکومت نے دریائے گنگا کی ڈولفن کو قومی آبی جانور کا رُتبہ عطا کیا ہے۔ بھاگا پور ضلع میں سلطان گنج سے کھالا گاؤں تک ۶۰ کلومیٹر چوڑا ''وکرم شیلا گنگاٹی ڈولفن کی پناہ گاہ ہے۔'' (Vikramshila Gangetic Dolphin Sanctuary)

بیس سالہ تحقیق کے بعد دریائے سندھ اور دریائے گنگا کی ڈولفن دو الگ نسلیں قرار پائی ہیں۔(۳۰)

بھاگل پور شہر تاریخی اہمیت کا بھی حامل ہے۔ اس شہر کی وجۂ شہرت صوفیاء کرام کے علاوہ مغل حکمراں بھی ہیں۔ کیوں کہ بہت سے مغلوں نے یہاں پڑاؤ ڈالا اور بعد میں اسی شہر کو مرکز بنا کر حکومت کی۔ یہاں موجود صوفیاء کرام کے مزارات اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ مغلوں سے قبل صوفیاء کرام کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر کے تمام مسلم محلوں میں نئی مساجد کے ساتھ ساتھ کچھ مساجد کئی سو سال پُرانی بھی موجود ہیں جس میں چمپا نگر کی مسجد سرِ فہرست ہے۔ یہ مسجد ۱۴۹۱ء میں لودھی دَور حکومت میں تعمیر ہوئی بھی کا ذکر مشہور مؤرّخ آر آر دواکر نے اپنی کتاب ''بہار کے ادوار'' میں بھی کیا ہے۔(۳۱) یہ مسجد خصوصی توجہ اور دیکھ بھال کی وجہ سے ضلع کی سب سے بڑی مسجد ہے جو محلّے کے وسط میں خوب صورتی اور دلکشی کا شاہکار چار منزلہ عمارت کا منظر پیش کرتا ہے۔(۳۲) اس شہر میں زیادہ تر مساجد ۱۵ سے ۱۷ صدی میں بنائی گئیں جس میں مغل پورہ کی مسجد، شاہ

جنگی عیدگاہ، قاضی چک کی مسجد شاہجہاں مسجد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ حکمران شہباز محمد ۸۷-۱۵۷۷ء نے بھاگل پور میں آنے کے بعد ایک مدرسہ ''آستانۂ شہاب ضیا'' بنوایا تھا۔(۳۳) مغل بادشاہ شاہجہاں عہد طالب علمی میں اسی مدرسے سے بہرہ مند ہوئے تھے جس کے بعد اس کا نام شاہجہاں مسجد رکھ دیا گیا۔ آج بھی اس مسجد کی تزئین و آرائش کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف عہد میں متعدّد حکمرانوں نے بہت ہی خوب صورت و دیدہ زیب مدارس و مساجد کی عمارتیں تعمیر کروائیں جو آج بھی دیکھنے والوں کو عہد گزشتہ کی فنِ تعمیرات کے جوہر سے آشنا کرتی ہیں۔(۳۴)

مولانا ظفر علی خان نے مسلم لیگ کی تنظیم سازی کے لیے بھاگل کا دورہ کیا جہاں مسلمانوں کے اُخوت کے مظاہروں نے ان کے دل پر بہت خاص اثر کیا اور مسلم لیگ کی جانب سے شاندار جلسہ ہوا اور اربابِ ذوق کو فی البدیہہ نظم سنائیں:

مکّہ سے دہلی تک اور دہلی سے بھاگل پور تک ۔۔۔ دین کا پھیلاؤ ہے اس سے بھی آگے دُور تک

میری آنکھوں میں بسا نورِ خدا فاران پر ۔۔۔ موسیٰ عمراں نے کیا پایا پہنچ کر طور تک

ایشیاء میں ہورہا ہے پھر وہی ہنگام گرم ۔۔۔ جس کی رونق تھی کبھی ٹیپو تک اور تیمور تک

(نظم: بھاگل پور، ص ۱۵۰، ۴ مئی ۱۹۳۹ء)

۴۔ بٹالہ

بھارتی صوبہ پنجاب کی آٹھ ریاست لدھیانہ، امرتسر، جالندھر، پٹیالہ، بھٹنڈا، موہیل، ہوشیار پور اور بٹالہ شامل ہیں۔ بٹالہ شہر بھارتی صوبہ پنجاب کی ریاست میں آبادی کے لحاظ سے آٹھواں بڑا شہر ہے۔ بھٹنڈا کے بعد دوسرا بڑا تاریخی شہر بٹالہ ہی ہے۔(۳۵) بٹالہ شہر سکھ عقیدت مندوں کے لیے ایک اہم مذہبی شہر کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ ۱۴۸۵ء میں سکھ مذہب کے بانی (رُوحانی پیشوا) گرونانگ دیو نے یہاں مل چند چوانا کی بیٹی سے شادی کی جو ماتا سلکھنی کہلائیں۔(۳۶) اس عہد کے یادگار میں مندر اور گوردوارے کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ ہر سال سکھ عقیدت مند کثیر تعداد میں گرونانگ اور ماتا سلکھنی جو مل چند چوانا کی شادی کی سالگرہ مذہبی جوش و جذبے سے منانے کے لیے یہاں آتے ہیں یہاں سکھوں کے چھٹے مذہبی رہنما ہرگوبندھ سکھ کا اہم گوردوارہ بھی موجود ہے۔(۳۷)

برطانوی عہد میں پنجاب کے علاقے گورداس پور کا ضلعی صدر دفتر (ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر) بھی بٹالہ ہی تھا۔ تقسیمِ ہند کے وقت گورداس پور کا الحاق ایک اہم مسئلہ تھا کیوں کہ مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی لیکن ریڈ کلف ایوارڈ (لارڈ ویول) نے تحصیل بٹالہ، ضلع گورداس پور اور پٹھان کوٹ کو ہندوستان میں شامل کردیا اور ضلع شکر گڑھ پاکستان کو دیا۔(۳۸) ۱۷/اگست ۱۹۴۷ء یعنی صرف تین دن تک بٹالہ پاکستان کا حصّہ رہا۔ تقسیم کے بعد آدھے سے زیادہ مسلمان پاکستان چلے گئے۔(۳۹)

موجودہ دَور میں بٹالہ میں ۵۶ فیصد ہندو اور باقی سکھ آبادی ہے۔ ماضی میں بٹالہ صنعتی اور زرعی پیداوار کے لیے پورے ایشیاء میں مشہور تھا۔ مشینوں کے پرزہ جات اور اون کی پیداوار کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ بٹالہ شہر کا رقبہ ۳۳ مربع

کلومیٹر ہے اور یہ شہر ۲۴۹ میٹر سطح سمندر سے بلندی پر واقع ہے۔ یہاں کی دفتری زبان پنجابی ہے۔[۴۰]

دو غم تھے جہاں میں غمِ وزد غم کالا | گر میری قناعت سے نہ پڑتا انھیں پالا
بچ کر نکل آیا ہوں میں ان دونوں کی زد سے | جس طرح اندھیرے سے نکلتا ہے اُجالا
کل لیگ نے یہ راز بٹالہ میں کیا فاش | ہے کانگریس انگریز کی اغراض کا آلہ
ہوتی ہے مری طبع یہاں آکے رواں اور | مضمون سمجھاتا ہے نئے مجھ کو بٹالہ

(نظم: بٹالہ، ص ۱۶۴۔۱۶۵، بٹالہ (گورداس پور)، ۱۶/اگست ۱۹۳۹ء)

۵۔جھانسی

جھانسی ہندوستان کے علاقے اُتر پردیش کا تاریخی شہر ہے۔ یہ شہر زرعی مارکیٹ اور چھوٹی صنعتوں کا مرکز ہے۔ یہاں لوہے اور فولاد کے کارخانے بھی ہیں۔ یہاں ۱۶۱۲ء میں راجپوتوں نے ایک قلعہ بنایا تھا۔[۴۱] ۱۷۴۲ء میں مرہٹوں نے اس کو اور مضبوط کیا۔[۴۲] ۱۸۵۷ء میں جھانسی ایک الگ ریاست تھی جہاں کی رانی "لکشمی بائی" نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس وقت لارڈ کیننگ (Lord Canning) گورنر جنرل تھے۔[۴۳]

جھانسی ریاست کی رانی "لکشمی بائی" ۱۹ نومبر ۱۸۲۸ء کو بنارس میں پیدا ہوئیں۔ یہ اس ریاست کی ملکہ اور آخری حکمراں تھی جس نے ۲۱ نومبر ۱۸۵۳ء سے ۱۸ جون ۱۸۵۸ء تک حکومت کی۔ وہ جنگِ آزادیٔ ہند ۱۸۵۷ء میں بھرپور کردار نبھانے والے ان لیڈروں میں سے ایک تھی جنھوں نے ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کروانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ بالآخر ۱۸ جون ۱۸۵۸ء کو انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں شدید زخمی ہو کر گوالیار میں جاںبحق ہوگئیں۔[۴۴]

لیگ کو دی خدا نے فتح مبیں | کانگریس کو شکست فاش ہوئی
جان لاہور لے گیا جس کی | جاکے جھانسی میں سُر گباش ہوئی

(نظم: جھانسی کی مسلم لیگ کی شاندار فتح، ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء، دیوان: ج، ص ۸۹)

۶۔دکن

حیدرآباد دکن ہندوستان کی جنوبی ریاستوں آندھرا پردیش اور تلنگانہ کا مشترکہ دارالخلافہ ہے۔ یہ بھارت کا چوتھا سب سے بڑا شہر ہے اور اس کی آبادی ستر لاکھ ہے۔ حیدرآباد دکن کو موتیوں اور مسلمان نظام بادشاہوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ موجودہ عہد میں انفارمشن ٹیکنالوجی، آئی ٹی اور بائیوٹیکنالوجی کا مرکز مانا جاتا ہے۔ حیدرآباد کے انفوٹیک پارک کو "سائبر آباد" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُردو اور تیلگو بڑی زبانیں ہیں۔[۴۵]

دکن ہندوستان میں مسلمانوں نے قریب سات سو سال شان و شوکت اور جاہ و جلال سے حکمرانی کی۔ آخری سوا دو سو سال میں آصف جاہی خاندان کی حکمرانی تھی جس نے اس خطے کو پُرامن بنا کر مذہبی رواداری اور گنگا جمنی تہذیب کی

آبیاری کی سیاسی تعلیمی تجارتی، صنعتی زرعی، فلاحی، اعلیٰ عدالتی غرض ہر شعبے میں وہ ترقی ہوئی کہ حیدرآباد دکن ہندوستان کی مثال اور ترقی یافتہ مملکت بنی۔[۴۶]

ریاست حیدرآباد دکن کا جغرافیائی نقشہ ہر دَور میں بدلتا رہا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء تک جب ہندوستانی فوجوں نے نظام کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ اس وقت تک بھی ایک عظیم رقبہ (۸۶ ہزار مربع میل) پر پھیلا ہوا تھا۔ اور جب کہ موجودہ حیدرآباد تقریباً دوہزار مربع میل پر مشتمل ایک شہر ہے جس کے باقی حصّے ریاست آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہارشٹر میں تقسیم ہو چکے ہیں۔[۴۷] ۱۹۲۳ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد اسلامی مملکتیں باقی تھیں۔ (سعودی عرب، افغانستان، ایران پر مشتمل تھیں) لیکن خوشحالی و شان و شوکت کے لحاظ سے حیدرآباد دکن بین الاقوامی اہمیت کا حامل تھا کہ لارڈ ماؤنٹ (Lord Mount) نے اپنی سوانح عمری میں کہا کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب انگلستان معاشی طور پر دیوالیہ ہوا تو نواب میر عثمان علی خان کے گراں قدر عطیات نے بڑی حد تک سہارا دیا۔[۴۸] مزید برآں حجازِ مقدسہ (مکّہ مکرمہ، مدینہ منورہ) کے پانی بجلی کے اخراجات بھی اسی ریاست کے ذمّے تھے۔ اس عظیم مقصد کے لیے "مدینہ بلڈنگ" کے نام سے شاندار عمارتیں (جواب بھی باقی ہیں) اس فریضے کے لیے وقف تھیں جن کے کرائے حجازِ مقدسہ کو بھیجے جاتے تھے۔ حاجیوں کے رہائش کے لیے نظام نے رباط کے نام سے حجاز میں حرمین سے نزدیک عمارتیں بنوادی تھیں۔[۴۹]

تاریخ کے مطابق یہ علاقہ کبھی آندھرا یا سات واہن سلطنت کا قصّہ تھا۔ بارہویں صدی عیسوی میں چالوکیہ کے سقوط کے بعد علاقہ برار دیوگیری کے یادو کے زیرِ تسلّط رہا اور تیرہویں عیسوی کے آخر میں مسلمانوں (علاؤ الدین خلجی) کے اس علاقے کا رُخ کیا تو یہ خطہ ان کے پاس چلا گیا۔[۵۰]

۱۳۴۸ء میں دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے پانچ صوبے تھے۔ ان پانچوں صوبوں کے حاکم مختلف اور فوج علیٰحدہ تھی۔ مرہٹوں نے اپنے عروج کے زمانے میں دکن کو بھی خوب تاراج کیا۔[۵۱] پندرہویں صدی کے آغاز میں سلطنت بہمنیہ کا خاتمہ ہوا اور اس کے بطن سے پانچ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں۔[۵۲]

دکن کی سلطنتیں (۱۶۸۶ء۔۱۵۲۷ء) مختلف نسلی پس منظر (افغان، ترک، مغل) سے پانچ خاندانوں کی قائم کردہ سلطنتیں تھیں۔[۵۳]

۱۔ احمد نگر سلطنت: اسے نظام شاہی سلطنت بھی کہا جاتا تھا جو شمال مغربی دکن میں واقع تھی۔ ملک احمد جو بہمنی سلطنت کا گورنر تھا۔ ۲۸ مئی ۱۴۹۰ء کو بہمنی افواج کو شکست دے کر آزادی کا اعلان کیا۔ نظام شاہی خاندان کی بنیاد بطور احمد نگر سلطنت رکھی۔ ابتدا میں اس کا دارالحکومت جنار تھا۔ ۱۴۹۴ء میں نئے دارالحکومت احمد نگر کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۶۳۶ء میں اورنگ عالمگیر نے (جو اس وقت دکن کا گورنر تھا) احمد نگر سلطنت کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر دیا۔

۲۔ سلطنت برار: اسے عماد شاہی سلطنت بھی کہا جاتا تھا۔ بہمنی سلطنت کے بکھرنے کے بعد ۱۴۹۰ء میں وجود میں

آئی جس کا دارالحکومت اچلپور تھا۔

۳۔سلطنت بیدر (۱۶۱۹ء۔۱۴۸۹ء): اسے برید شاہی سلطنت بھی کہتے ہیں جو ۱۴۸۹ میں قائم ہوئی۔ فارسی اور دکنی زبانیں بولی جاتی تھی۔

۴۔ بیجاپور سلطنت (۱۶۸۶ء۔ ۱۴۹۰ء): اسے عادل شاہی خاندان بھی کہا جاتا ہے۔ اب ہندوستان کے صوبہ کرناٹک میں شامل ہے۔ یہاں دکنی زبان بولی جاتی تھی۔ اس کا دارالحکومت بیدر تھا۔

۵۔ گولکنڈہ سلطنت (۱۶۸۷ء۔۱۵۱۸ء): اسے سلطنت قطب شاہی بھی کہا جاتا تھا۔ قرہ قویونلو کی ایک ترک سلطنت تھی جو فارسی ثقافت سے متاثر تھی۔ یہاں فارسی، ترکی، دکنی اُردو بولی جاتی تھی۔[۵۴]

ان ریاستوں میں سے قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتیں علم دفن کے فروغ اور فارسی و اُردو شعر و اَدب کی ترقّی و سرپرستی میں نسبتاً زیادہ آگے رہیں۔ ان سلطنتوں نے عالمِ عرب، ایران وسط ایشیا کے ماہرِ فن، ادیب و دانشور سمیت عالم فاضل کو اپنی سلطنت وابستہ کیا اور ساتھ ہی معماروں، مصوّروں، موسیقاروں کی سرپرستی کی جس کے باعث حیدرآباد دکن اور بیجاپور شہر سازی اور اسلامی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ بنا۔ عادل شاہی کے اہم شاعر ''حسن شوقی'' نے ''میزبانی نامہ'' لکھا۔[۵۵] نصرتی نے ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' جیسی طویل مثنویاں لکھیں۔[۵۶]

قطب شاہی عہد کے بڑے شاعروں میں خود حکمراں شاعر قلی قطب شاہ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ ملک الشعراء ملا وجہی اسی دربار سے وابستہ تھے۔ قلی قطب کا بیٹا عبداللہ قطب بھی فن و اَدب اور علم دوست تھا۔ اس کے عہد کا شاعر غواصی نے مثنوی ''طوطی نامہ'' لکھی۔[۵۷]

حیدرآباد دکن اسلامی سلطنتوں کے خاتمے کے بعد مغل خاندان کے حکومت کے زیرِ نگیں ہوگیا۔ اورنگ زیب کے بعد کا ہندوستان انتشار، افراتفری اور طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک مغل صوبہ دار نظام الملک آصف جاہ نے ۱۷۲۰ء میں دکن کو خود مختار حیثیت دے کر سلطنتِ آصفیہ کی بنیاد ڈالی تا کہ ان علاقوں میں مسلمانوں کو جائے پناہ مل سکے لیکن دربار دہلی سے اپنا تعلق ختم نہیں کیا۔[۵۸] دلّی اور لکھنؤ کے زوال کے بعد مختلف مشاہیرِ فن، شعراء فضلاء کے ساتھ افواج و سپاہ نے بھی دکن کا رُخ کیا اور دربار آصفیہ سے وظائف وصول کرتے رہے۔[۵۹]

۱۸۹۶ء میں مولانا ظفر علی خان حیدرآبادی فوج میں ملازم ہو کر سلطنتِ آصفیہ سے جڑ گئے۔ ان کا رینک لیفٹیننٹ کا تھا۔ مگر وہ فوج میں زیادہ دیر نہ رہے اور ہوم آفس میں منتظم پیشی و مترجم کا عہدہ سنبھال لیا۔ پھر لیجسلیٹو کونسل کے رجسٹرار کی اضافی خدمت سنبھالی۔[۶۰] آصفیہ کی ملازمت سے ادبی سرگرمیاں عروج پانے لگیں۔ انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی تراجم کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر ۱۹۰۲ء میں ایک ماہوار رسالہ ''افسانہ'' جاری کیا[۶۱] جو تقریباً ایک سال تک نکلتا رہا پھر ۱۹۰۴ء میں ''دکن ریویو'' (ماہوار) جاری کیا۔ جس میں مشرق و مغرب کے صحت مند خیالات کا امتزاج اور ادبیاتِ اُردو کو مغربی تنقیدی

اُصولوں کے مطابق پرکھا جاتا۔(۶۲)

۱۹۰۵ء میں رودِ موسیٰ (دکن کی ندی) میں طغیانی کے باعث سیلاب زدگان کی امداد کے لیے حکومت آصفیہ نے مولانا ظفر علی خان کو افضل گنج کے علاقے میں افسر مقرّر کیا۔ جہاں تقریباً ۵۰ ہزار افراد کے کھانے پینے، کپڑے اور رہائش کا انتظام کیا اور ایک پُرتاثیر نظم ''شورِ محشر'' لکھی۔(۶۳)

او نامراد ندی تجھ پہ غضب خدا کا	اُلٹا ہے تُونے تختہ یارانِ آشنا کا
اِک کاروانِ آصف اُترا ترے کنارے	او ناسپاس تُونے ڈالا ہے اسی پہ ڈاکا
تیری ہر ایک ٹکر داعی بنی اجل کی	تیرا ہر ایک تھپیڑا قاصد بنا قضا کا
اس واقعے کا ماتم برسوں بپا رہے گا	کانٹا ہر ایک دل میں غم کا چبھا رہے گا

۱۹۰۹ء میں دکن سے کرم آباد چلے گئے پھر ۱۹۱۸ء میں دکن آئے لیکن پھر سازشی عناصر اور برطانوی استعمار کی ایما پر وظیفے کے ساتھ پنجاب چلے جانے کا حکم صادر ہوا۔(۶۴)

ریاست حیدرآباد دکن ہمیشہ ہندو مسلم یکجہتی، علم واَدب نوازی کی مثال تھا جس کا علماء و دانشور مفکرین ومؤرّخین نے آکر اپنی خدمات سے مزید چار چاند لگائے۔

مسلماں ہے تو مسلم لیگ کا جھنڈا اُڑاتا چل	پیام آزادیِ کامل کا ملت کو سناتا چل
دکن میں آریوں کا فتنہ گر ہے روکنا تجھ کو	تو آصف جاہ کے دربار میں یہ نغمہ گاتا چل

(نظم: دکن میں آریہ سماجی فتنہ کی روک تھام، ۵ جون ۱۹۳۹ء، دیوان: چ، ص ۱۵۴)

بننے والی ہے دکن کی سرزمین جنت نشاں	بادلوں سے لے کے اُترا ہے مُژدہ میگھ دُوت
رنگ کے اور نسل کے سب تفرقے مٹ جائیں گے	درس اُخوت کا پڑھائے گا مسلماں کو اچھُوت

(نظم: دکن کے اچھوت، ۲۱ جولائی ۱۹۳۹ء، دیوان: چ، ص ۱۵۹)

۷۔ سکھر

پاکستان کے صوبۂ سندھ کا قدیم تاریخی اور تیسرا بڑا شہر سکھر ہے جو کہ پاکستان کا چودھواں بڑا شہر ہے۔ یہ شہر قدیم اور جدید کی دو بستی میں منقسم ہے۔ ان دو بستیوں کو ریل کی پٹری ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔(۶۵) نئی آبادی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے پاس بسی ہے جو دریائے سندھ کے شمالی اور جنوبی کنارے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ روہڑی شہر سے شروع ہوتا ہے۔ درمیان میں دریا ہے اور دریا میں بھکر کا جزیرہ آباد ہے۔ بھکر چونے کے پتھر کی چٹان ہے جو ۸۰۰ گز لمبی اور ۳۰۰ گز چوڑی اور تقریباً ۴۵ فٹ اُونچی ہے۔ بھکر اور سکھر کے درمیان دریا کا عرض تقریباً ۱۰۰ گز ہے۔(۶۶)

۱۵۲۰ء کے قریب شاہ بیگ ارغواں نے بھکر کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور بھکر کی فصیل اور برج و باروکو پہلے سے زیادہ

مستحکم کیا اور بھکر کی آبادی کو سکھر اور روہڑی میں منتقل کیا۔(۶۷) نادر شاہ کے حملے کے بعد بھکر اور سکھر کا علاقہ ایران سے ملحق ہوا۔ انیسویں صدی کے ربع اوّل میں تالپوروں کے زیرِ دست آ گیا(۶۹) اور ۱۸۴۲ء میں انگریزی سرکار سے متعلق ہوا۔ انگریزوں نے اسے فوجی چھاؤنی بنایا۔ تجارت پیشہ لوگ آباد ہوئے اور دریا کے کنارے سکھر جدید آباد ہو گیا۔ اس زمانے میں مختلف شہروں میں (کراچی، کوٹری، ملتان، لاہور) ریل کی وجہ سے تجارتی آمدورفت کے لیے سکھر کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔(۶۹)

تھارنٹن کے مطابق:

''اس میں ۴۰ آباد اور ۸۰ ویران مسجدیں موجود ہیں۔''(۷۰)

سکھر کی نہایت اہم عمارت میر معصوم شاہ بکھری کا مینار ہے۔ میر معصوم شاہ کے بزرگ سادات ترمذ میں سے تھے۔ میر معصوم شاہ بیک وقت خطاط، شاعر، مؤرّخ، منشی طبیب، بہادر سپاہی اور سیاسی تدبر رکھنے والے تھے۔ مغل عہد کی کتابہ نویسی میں انھیں کمال حاصل تھا۔(۷۱)

تحریکِ خلافت کے زمانے میں سکھر کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ سندھ میں تحریکِ خلافت کی پہلی کانفرنس لاڑکانہ، دوسری سکھر میں ہوئی۔ فروری ۱۹۲۰ء کو ایک جلسہ ہوا(۷۲) جس میں انقلابی لیڈر علی برادران، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبدالباری اور مسٹر گاندھی نے شرکت کی۔ مولانا رُشد اللہ پیر جھنڈے والے نے خطبہ دیا۔ اس کارواں میں مولانا ظفر علی خان بھی شامل تھے۔ اس کے بعد ہی سندھ کے مختلف علاقے میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ پاکستان کا زور پکڑتا چلا گیا۔ سکھر میں تحریکِ خلافت کے زیرِ اثر ترکِ موالات کا جوش دیدنی تھا۔(۷۳)

غیر کی تحویل میں مسجد ہے منزل گاہ کی — قبضۂ طاغوت میں ہے جائداد اللہ کی
آج سکھر میں ہے دنگل کُفر اور اسلام کا — دیکھ لے ہندوستاں کُشتی یہ کوہ و کاہ کی
سندھیوں کو جا کے دو پیغام مسلم لیگ کا — ہے تلاش اُن کو گر آزادی کی سیدھی راہ کی

(نظم: مسجد منزل گاہ سکھر، ۸ اگست ۱۹۳۹، دیوان: چ، ص ۱۶۳)

۸۔ شہید گنج

یہ مسجد شہید گنج، نولکھا بازار، لاہور، پنجاب پاکستان میں واقع ہے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے دہلی دروازے کی جانب سرائے سلطان کے بالمقابل وہ عمارت ملے گی جسے سکھ گوردوارہ شہید گنج کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔(۷۴) اس گوردوارے کے احاطے میں وہ مسجد واقع تھی جسے مسجد شہید گنج کہا جاتا ہے۔ اس سے قبل اس مسجد کا نام عبداللہ خان تھا۔(۷۵)

یہ مسجد شاہجہاں کے عہد میں بنی جسے شہزادہ داراشکوہ کے خانساماں عبداللہ خان (جو بعد میں لاہور کا کوتوال بنا) نے ۱۶۵۳ء میں تعمیر کروائی۔(۷۶) مغل حکمرانوں کا زوال قریب آیا تو سکھوں نے ۱۷۵۷ء سے پنجاب اور بالخصوص لاہور پر قبضہ کر کے لوٹ مار اور غنڈہ گردی شروع کر دی۔ مسلمانوں کی تاریخی املاک کو نقصان پہنچایا جس میں ''مسجد عبداللہ خان'' بھی

سکھ گردی کی نذر ہوگئی اور سکھوں نے مسجد عبداللہ خان پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔(۷۷)

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد شہید گنج کو سرکاری سرپرستی میں ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات کو مسمار کیا گیا اور مسجد کی حرمت پر مرمٹنے والوں کو بڑی سنگدلی سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔(۷۸) ایسے نازک موقع پر مولانا ظفر علی خان نے پنجاب کے مسلمانان کی قیادت کا فیصلہ کیا اور ''مجلس اتحاد ملت'' کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم کے رضا کاروں کی وردی کا رنگ نیلا تھا اس لیے اس جماعت کو نیلی پوشوں کی جماعت بھی کہا جاتا ہے۔(۷۹) اس دوران حکومت برطانیہ نے مولانا ظفر علی خان کے ''زمیندار'' کی اشاعت پر پابندی لگا کر کرم آباد میں نظر بند کر دیا۔ قائداعظم لاہور آئے اور حکومت پنجاب سے مل کر سیاسی فضا کو اعتدال پر لانے کے لیے نظر بندوں کو رہائی دلوائی۔(۸۰) اس ذیل میں بادشاہی مسجد لاہور میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں قائداعظم نے مولانا ظفر علی خان کی ملّی خدمات کا اعتراف یوں کیا:

> آپ مجھے مولانا ظفر علی خان جیسے دو چار انسان دے دیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔(۸۱)

مجلس اتحاد ملت نے شہید گنج کے لیے عدالتی چارہ جوئی کی مگر اس مسئلے کو قانون کے بجائے سیاسی شکل دے دی گئی تھی اور عدالتی فیصلہ سیاسی نوعیت کا تھا۔ نومبر ۱۹۳۷ء میں پنجاب چیف کورٹ نے کثرت رائے سے فیصلہ مسلمانوں کے خلاف دیا۔ صرف جسٹس دین محمد نے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دیا۔(۸۲)

شہید گنج کی مسجد پکارتی ہے تمھیں — دبے ہوؤ وہ خود اُٹھ کر اُبھارتی ہے تمھیں
وہ اس جہاز سے، جو گھر گیا ہے طوفاں میں — کنارہ پر بہ سلامت اُتارتی ہے تمھیں

(نظم: مسجد شہید گنج کی پکار، ۱۶ اگست ۱۹۳۶ء، دیوان: چ، ص ۱۳)

۹۔ کٹھیار

مغربی بنگال کی سرحد پر واقع کٹھیار بھارتی ریاست بہار کے ۳۸ اضلاع میں سے ایک ضلع ہے اور کٹھیار شہر اس ضلع کا انتظامی مرکز ہے۔ پہلے یہ پورنیہ ضلع کا ایک حصّہ تھا۔ مغل حکومت کے تحت اس ضلع کا قیام حکومت تیج پور نے کی تھی۔(۸۳) تیرہویں صدی کے آغاز میں یہاں پر محمد دین نے راج کیا۔ ۱۷۷۰ء میں جب محمد علی خان پورنیہ کے گورنر تھے، اس وقت یہ ضلع برطانوی حکومت کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ایک طویل عرصے تک اس جگہ پر بہت حکومتوں نے راج کیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد بالآخر ۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ایک الگ اور آزاد ضلع کے طور پر اعلان کر دیا گیا۔(۸۴)

کٹھیار ضلع گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ اور بہت عمدہ مثال ہے۔ یہاں اسلامی مدارس کے ساتھ ساتھ عصری علوم کے کالجز موجود ہیں۔ خود حکومتِ بہار کی طرف سے یہاں اسلامی مدارس چلتے ہیں۔ غیر حکومتی چھوٹے بڑے مدارس اچھی تعداد میں موجود ہیں۔ عصری علوم میں کٹھیار کا میڈیکل کالج سب سے زیادہ توجہ کا مرکز ہے۔ یہاں میتھلی، ہندی، اُردو، بنگلہ، سرجاپوری،

بھوجپوری اور انگریزی زبان بولی جاتی ہے۔(۸۵)

مولانا ظفر علی خان بہار کے دورہ سے واپس آتے ہوئے کٹھیار کی اسلامی اُخوت کے مہمان بنے اور مسلم لیگ کی تحریکِ آزادی کا پیغام دیا۔

مبارک ہو مسلمانانِ کٹھیار — کہ ہوتا ہے تمہارا بخت بیدار
کفن باندھے ہوئے نکلے ہیں گھر سے — قیامت ہے مسلمانوں کی یلغار
کہاں ہے ہمت اتنی کانگرس میں — کہ روکے بڑھ کے مسلم لیگ کا وار
مجھے سرکارِ بطحا سے غرض ہے — نہیں سرکارِ لندن سے سروکار

(نظم: کٹھیار، ۷ مئی ۱۹۳۹ء، دیوان: چ، ص: ۱۵۰)

۱۰۔کشن گنج

بھارتی ریاست بہار کے ۳۸ اضلاع میں سے ایک ضلع کشن گنج ہے اور اس ضلع کا انتظامی مرکزی دفتر کشن گنج ٹاؤن ہے۔ کشن گنج صوبہ بہار کے پورنیہ ڈویژن کا حصّہ ہے۔ سیمانچل بہار کے شمال مشرقی حصّے میں میتھیلا علاقے کا ایک ذیلی علاقہ ہے جس میں چار اضلاع ارریہ، پورنیہ، کٹھیار اور کشن گنج شامل ہیں۔ یہ بھارت کے پسماندہ علاقوں میں سے ایک تھا لیکن اب یہ ترقیاتی مرحلے میں ہے۔(۸۶)

کش گنج ڈسٹرکٹ (ضلع) ۱۴ جنوری ۱۹۹۰ء کو وجود میں آیا جو سماجی کارکنوں، سیاست دانوں، صحافی، تاجر، کسان وغیرہ کی طرف سے سترہ سال کی طویل اور سخت جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ اس سے قبل کشن گنج (ضلع) پورنیہ ضلع کا حصّہ تھا۔ لیکن اب یہ علیحدہ ایک ضلع ہے۔ کشن گنج ضلع شمال میں نیپال اور مشرق میں مغربی بنگال سے ملا ہوا ہے۔(۸۷)

کشن گنج میں انجینئرنگ کالجز اور دیگر تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ حکومت نے نجی تعلیم اور اقلیتوں کی مدد کے لیے خصوصی مراکز بھی بنائے ہیں۔ جامعہ حسینیہ کشن گنج بہار الہند ایک معتبر و معروف اور مستند تصحیح و تجوید کی درسگاہ ہے۔ جہاں بیسویں صدی سے طلبا کی بڑی تعداد ہمہ وقت ادارہ میں رہ کر علمی تشنگی بجھاتے ہیں۔(۸۸) کشن گنج ریلوے اسٹیشن تمام بڑی ریلوے لائنوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس میں بالخصوص (N.H.31) ریلوے اسٹیشن شمال جنوبی علاقوں کو بھارت سے جوڑتے ہیں۔ غریب نواز ایکسپریس یہاں سے شروع ہوکر اجمیر تک جاتی ہے۔ دیگر ریلوے لائنیں تمام بڑے شہروں دلی، بمبئی، پٹنہ، کلکتہ، چنئی، بنگلور، دکن کو جاتی ہیں۔ یہاں شرح خواندگی ۴۷ فیصد ہے۔ یہاں کی دفتری زبان اُردو، ہندی، سورجاپوری ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۷۰ فیصد سے زائد ہے۔(۸۹)

مولانا ظفر علی خان سیاسی مشن کے تحت بہار کا دورہ کرتے ہوئے کشن گنج گئے جہاں مقامی مسلم لیگ کی طرف سے منعقد کردہ جلسہ میں شرکت کی تو خبر ملی کہ گاندھی جی نے راج کوٹ میں بصد حسرت اپنی شکست مان لی اور صاف الفاظ میں

اعتراف کیا کہ یہاں ان کی اہنسا بھی ان کے کام نہ آئی یہ نظم اسی واقعے کی یادگار ہے۔

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ باطل کو کچل دو — اور اس نئی تحریک کا مرکز ہے کشن گنج
گاندھی کی آہنسا میں نہیں کچھ بھی رہا وزن — لازم ہے کہ کہیے اسے بُجھڑا ہوا اسفنج
ہر نغمہ سے پیدا ہوئی مِلّت میں نئی رُوح — میں جب سے ہوں اسلام کے گلشن میں نواسنج

(نظم: کشن گنج، ۳ مئی ۱۹۳۹ء، دیوان: چ، ص ۱۴۹)

۱۱۔کھاریاں

پاکستان کے صوبۂ پنجاب کے ضلع گجرات کی ایک تحصیل کھاریاں ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ تحصیل کھاریاں جہلم اور چناب کے درمیان واقع ہے۔ اس تحصیل کو پاکستان کی امیر ترین تحصیل ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ کیوں کہ یہاں کی آبادی کا زیادہ تر حصّہ بیرونِ مُلک بسلسلہ روزگار مقیم ہیں جو ہر سال کروڑوں زرِمبادلہ کے طور پر پاکستان بھیجتے ہیں۔ یہاں پاکستان کی سب سے بڑی فوجی چھاؤنی کھاریاں چھاؤنی قائم ہے۔[۹۰]

مولانا ظفر علی خان نے کھاریاں میں شاندار اسلامی جلسہ میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے۔ جہاں اربابِ ذوق کی فرمائش پر کھاریاں کے قافیے پر یہ نظم کہی اور ملت کا جوش بلند کیا۔

ہند میں مِلّت کو پیش آتی ہیں جو دُشواریاں — باعث اُن کا ہیں خود اپنی ہی غلط کرداریاں
گر مسلماں ہے تو گردنِ حق کے دستہ میں کٹا — کاش گوشِ ہوش سے سُن لے یہ نکتہ کھاریاں

(نظم: کھاریاں، ۴ جولائی ۱۹۳۸ء، دیوان: چ، ص ۱۲۵)

۱۲۔گوندل

اس گاؤں کا مکمل نام گوندل منڈی ہے جو ضلع کامل پور میں شامل ہے جو صوبۂ پنجاب کے تحصیل اٹک کے علاقے چھچھ کا حصّہ ہے۔ گوندل منڈی ایک خوب صورت اور زرخیز علاقے میں واقع ہے۔ دریائے سندھ اور تربیلا کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس علاقے کی زمینیں سونا اُگلتی ہیں۔[۹۱]

صوبۂ پنجاب کے تحصیل اٹک کے اہم علاقوں میں حسن ابدال، جنڈ، فتح جنگ اور وادی چھچھ شامل ہیں۔ ضلع کے شمال میں دریائے سندھ ۸۰ کلومیٹر تک سرحدی پٹی کے طور پر بہتا ہے اور ضلع اٹک کو خیبر پختونخواہ کے اضلاع سے جدا کرتا ہے۔ اس ضلع کی حدود سات اضلاع سے ملتی ہیں۔ چار صوبہ خیبر پختونخواہ سے باقی تین پنجاب سے۔ سطح زمین کے حوالے سے ضلع کو چار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ شمالی میدان، کالا چٹا پہاڑ، وادئ سوات مکھڈ جنڈال پہاڑیاں۔ وادی چھچھ پچاسی دیہاتوں پر مشتمل ہے۔[۹۲] جس کے ایک گاؤں گوندل نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور آزادی کی اس لہر کا آغاز مولانا ظفر علی خان کی آمد اور تقاریر سے ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے پوری وادی چھچھ کو اپنی لپیٹ میں لے گیا۔

ہے تقاضا مجھ سے کامل پور کے احباب کا — کھینچ کر رکھ دوں میں ست اشعار میں پنجاب کو
میرے آگے ہیں اٹک کی موج ہائے رنگ رنگ — نشہ ہے جن کی روانی میں شرابِ ناب کو

(نظم: گوندل، ۱۸ مارچ ۱۹۳۸ء، دیوان: چ، ص ۱۱۶)

۱۳۔ لدھیانہ

موجودہ بھارت کے شمال مغرب میں ریاست پنجاب کے ۲۲ اضلاع میں سے ایک ضلع لدھیانہ ہے۔ اس کا دارالحکومت لدھیانہ شہر ہے۔ اس شہر کی جڑیں پندرہویں صدی عیسوی تک جاتی ہیں۔ لودھی خاندان (۱۵۲۶ء۔۱۴۵۱ء) کی حکمرانی کی وجہ سے اس شہر کا نام لدھیانہ پڑا وگرنہ اس سے قبل یہ ایک پسماندہ دیہات ''میر ہوٹا'' کے نام سے موسوم تھا۔[(۹۳)] سکندر لودھی نے اپنے فوج کے کمانڈر اور چیف یوسف خان اور نہنگ خان کو مقرّر کیا جنھوں نے لودھی حکومت کی مضبوطی کے لیے اس دیہات ''میر ہوٹا'' کو ہیڈ کوارٹر بنایا۔[(۹۴)] ماہرین کہتے ہیں کہ یوسف خان نے کھوکھر کو آزمانے کے لیے ستلج کو پار کیا۔ ان دنوں کھوکھر سلطان پور میں رہائش ہونے کے ساتھ ساتھ جالندھر پر قابض تھے۔ نہنگ خان نے اس وقت ایک بڑے دیہات (میر ہوٹا) کو مددگار کے طور پر برقرار رکھتے ہوئے اس کو لدھیانہ کا نام دیا۔[(۹۵)]

اگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو لدھیانہ لودھی حکومت کے دَور سے ہی پُرسکون رہا ان کے عہد میں لدھیانہ شہر کو مربع کلومیٹر کے حساب سے وسیع کیا گیا۔ پھر نہنگ خان کے پوتے جلال خان نے لدھیانہ فورٹ بنایا۔[(۹۶)] ۱۸۰۵ء میں اس شہر پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بالجبر قبضہ کیا۔ مہاراجہ کے دَور میں لدھیانہ شہر انگریزی حکومت کا ایک اہم مرکز رہا۔ پھر برطانوی حکومت اور رنجیت سنگھ کی گٹھ جوڑ سے یہ شہر ۱۸۰۹ء میں مکمل انگریزوں (حکومت برطانیہ) کے قبضے میں چلا گیا۔[(۹۷)] جس کے باعث لدھیانہ شہر کو مشکل حالات سے گزرنا پڑا لیکن یہ متحرک شہر مختلف ثقافت اور تہذیب کا گلدستہ ہے جہاں صحت مندانہ سرگرمیاں، ادبی مباحثے، گائیکی، رقص، کھیل کے مقابلے پھولوں کی نمائش، مصوّری اور دیگر لاتعداد سرگرمیاں ماند نہیں پڑیں اور مکمل آب و تاب اور جوش کے ساتھ چمک دمک برقرار ہے۔

لدھیانہ شہر پنجاب کا صنعتی حب ہے۔ یہ شہر صنعتی پیداوار (اونی کپڑا، مشینری، ڈیزل انجن، ٹائر ٹیوب اور دیگر) میں نمایاں ہونے کی وجہ سے ''بھارت کا مانچسٹر'' بھی کہلاتا ہے۔ یہاں ہر تین ماہ میں دس ہزار گاڑیاں تیار کی جاتی ہیں۔ یہاں کی صنعتی پیداوار اندرونِ مُلک کے ساتھ بیرونِ مُلک بھی برآمد کی جاتی ہے۔[(۹۸)]

سُنتا ہوں مرکزِ علما لدھیانہ ہے — جس کی گلی گلی میں اُنھیں کا فسانہ ہے
جب ہم محمدؐ عربی کے غلام ہیں — کیا غم اگر خلاف ہمارے زمانہ ہے

(نظم: لدھیانہ، ۲۶ جولائی ۱۹۳۸ء، ص ۱۳۱)

۱۴۔لکھنؤ

ہندوستان کی ریاست اُتر پردیش کا دارالحکومت اور اُردو زبان و اَدب کا قدیم گہوارہ ہے۔لکھنؤ کو مشرقی تہذیب و تمدن کی آماجگاہ بھی کہا جاتا ہے۔لکھنؤ اس خطے میں واقع ہے جسے ماضی میں اودھ بھی کہا جاتا تھا۔شہر کے درمیان میں دریائے گومتی بہتا ہے جو لکھنؤ کی ثقافت کا بھی حصّہ ہے۔لکھنؤ ہمیشہ سے ایک کثیر الثقافتی شہر رہا ہے۔ یہاں کے حکمرانوں اور نوابوں نے انسانی آداب،خوب صورت باغات، شاعری موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی خوب پذیرائی کی۔ لہٰذا لکھنؤ کو نوابوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔قدیم دَور میں لکھنؤ مملکت کوسل کا حصّہ تھا۔قدیم ہندو روایتوں کے مطابق یہ رام کی وراثت تھی جسے انھوں نے اپنے بھائی لکشمن کے لیے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کو لکشماوتی لکشم پور یا لکھن پور کے نام سے جانا گیا، جو بعد میں بدل کر لکھنؤ ہو گیا۔(۹۹)

۱۳۵۰ء کے بعد سے سلطنت دہلی، سلطنت جونپور، مغلیہ سلطنت اور نواب اودھ، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر برطانوی راج کے تحت لکھنؤ اودھ کا حصّہ رہا ہے۔(۱۰۰) ۱۷۱۹ء تک اودھ مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ تھا جس کا گورنر برہان الملک سعادت علی خان تھا جس نے لکھنؤ کے قریب فیض آباد کو اپنا مرکز بنایا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ بڑے مراکز میں سے ایک تھا۔تحریکِ آزادیٔ ہند میں بھی یہ ایک اہم شہر کے طور پر اُبھرا۔(۱۰۱)

خدا کا دل سے خوف اُٹھا نبیؐ کی بھی نہ شرم آئی   تجھے اے لکھنؤ منظور کیوں ہے اپنی رُسوائی
سبق ہندو نے سیکھا ہے یہ انگریزی سیاست سے   کہ سنی اور شیعہ کی نہ ہونے پائے یکجائی

(نظم: لکھنؤ، ۲ جون ۱۹۳۹ء، ص ۱۵۴)

۱۵۔موتی ہاری

ہندوستان کے صوبۂ بہار کے ضلع چمپارن کا شہر موتی ہاری ہے جو موتی ہاری ترہٹ ڈویژن کے ضلع چمپارن کا صدر مقام ہے۔(۱۰۲) موتی ہاری شہر من نامی قدرتی جھیل کے کنارے آباد ہے۔موسمِ سرما میں لاکھوں پرندے از قسم مرغابی و لالسر وغیرہ نقل مکانی کر کے اس جھیل میں آجاتے ہیں۔ یہاں شکار کی اجازت نہیں تھی لیکن مقامی چور ملاح شکار کر کے چوری چھپے بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔(۱۰۳)

برطانوی عہد میں کھٹمنڈو (نیپال) جانے کا واحد راستہ موتی ہاری ہو کر تھا۔موتی ہاری کے آگے رکسول ریلوے کا آخری اسٹیشن تھا۔ اس اسٹیشن سے تھوڑا آگے سوگولی نامی قصبہ سے نیپال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں انڈو نیپال وار میں نیپالیوں اور انگریزوں کے درمیان صلح ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ جگہ ''ٹریٹی آف سوگولی'' کے نام سے مشہور ہے۔(۱۰۴)

شمالی بہار میں بہت سے نیل کے کارخانے انگریزوں کے تھے جو کوٹھی کہلاتی تھی۔ جب جرمنی نے مصنوعی نیل ایجاد کر دیا تو یہ ہندوستانی نیل انڈسٹری بالکل تباہ ہو گئی اور اکثر نیل کے کارخانے شوگر ملز میں تبدیل ہو گئے۔(۱۰۵) نیل کی ایک کوٹھی کو سر عبداللہ ہارون نے جو ان دنوں شوگر کے بادشاہ کہلاتے تھے، خرید کر ایک شوگر مل کی بنیاد ڈالی۔ یہ شوگر مل مظفر پور سے موتی

ہاری کی جانب دوسرے ریلوے اسٹیشن موتی پور میں واقع ہے۔ پاکستان بننے سے کچھ پہلے سرعبداللہ ہارون نے اس شوگر مل کو فروخت کر دیا۔(۱۰۶)

موتی ہاری شہر میں گاندھی جی نے اپنی نیم سیاسی و نیم مذہبی مہاتمائیات کا آغاز کیا اور کچھ ہی عرصہ میں ان کی اسلام دشمن سرگرمیاں بڑھ کر ہندو جاتی کو سنگھٹن کی جانب راغب کیا۔ لہٰذا مسلم لیگ نے ان اقدامات کے ازالے کے لیے ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کی جس میں مولانا ظفر علی خان نے نہ صرف بھرپور انداز میں شرکت کی بلکہ ہزاروں مسلمانوں کی موجودگی میں مسلم لیگی جھنڈے کی پرچم کشائی کی اور ذیل کی نظم ان کے نوک قلم سے لکھی گئی:

چشمۂ زندگی قوم ہے موتی ہاری — ندیاں علم و عمل کی ہوئیں جس سے جاری
وقت آیا ہے کہ اسلام کا پرچم ہو بلند — اور اسے لے کے چلے ہاتھ میں موتی ہاری
ہارموتی کا مجھے آج پہننے کو ملا! — دیکھ لیجیے مرے اشعار کی گوہرباری

(نظم: موتی ہاری، ۱۵ مئی ۱۹۳۹ء، ص ۱۵۱)

۱۶۔ ناگ پور

ناگ پور شہر سولہویں صدی عیسوی تک جنگلات میں گھرا ہوا تھا اور تاریخی لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جب دیوگڑھ کے بانی راجہ جاٹبا (ف۔ ۱۶۲۰ء) کی حکومت ترقی کرتے ناگ پور کی سرحد تک پھیل گئی تو یہاں سپاہیوں کے لیے (حفاظت کی غرض سے) ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کروایا۔ یہیں سے رفتہ رفتہ ناگ پور آباد ہونے لگا۔(۱۰۷)

راجہ جاٹبا مغل بادشاہ جلال الدین اکبر (ف۔ ۷/اکتوبر ۱۶۰۵ء) کو سالانہ خراج دیتا تھا۔ اس کی وفات (۱۶۲۰ء) کے بعد ڈل شاہ بھی اپنے عہد میں جہانگیر اور شاہجہاں کو پابندی سے خراج دیتا لیکن اس کے انتقال (۱۶۳۴ء) کے بعد اس کا چھوٹا بھائی کوک شاہ (ف۔ ۱۶۴۸ء) دیوگڑھ کی تخت پر بیٹھا تو اس نے شاہجہاں کو خراج دینا بند کر دیا۔ چنانچہ شاہی حکم پر خان دوراں خان نے ۱۶۳۶ء میں ناگ پور کے قلعے کو قبضے میں کرلیا تو مجبوراً کوک شاہ کو تمام واجبات (خراج) ادا کرنی پڑیں۔(۱۰۸)

کوک شاہ کی وفات سے بخت بلند کی تخت نشینی (۱۶۹۱ء) تک ناگ پور کے قلعے میں گونڈ حکمرانوں کی فوج رہا کرتی تھی لیکن بخت بلند کے عہد (۱۶۹۱ء۔ ۱۷۰۹ء) میں ناگ پور میں بارہ چھوٹے چھوٹے قریے وجود میں آئے۔ ناگ پور، یہودی، ہری پور، شکر درہ، وٹھوڑا، اکری، لینڈلا، گاڈگا، پھوٹالا، بھانگیڑا اور سیتا بلڈی اور ان قریوں کے مجموعے کا نام راجا پور بارسا تھا۔(۱۰۹)

بخت بلند کا بھائیوں سے تخت نشینی کے معاملے پر اختلاف ہوا تو اس نے اورنگ زیب کے دربار میں آٹھ سال پناہ لی اور اسلامی تہذیب و تمدّن اور تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا جس پر اورنگ زیب نے ۹ رمضان ۱۱۰۲ھ (۱۶۹۱ء) کو راجہ کا خطاب دے کر دیوگڑھ کا حکمران بنایا جسے بدل کر بخت بلند نے ''اسلام گڑھ'' رکھا۔(۱۱۰) مساجد تعمیر کروائیں۔ ناگ پور

شہر کے زراعت، کاروبار میں مسلمانوں کو شریک کیا، یوں مسلمان آنے لگے اور ساتھ اُردو زبان بھی آئی۔ بخت بلند کے بعد اس کا بیٹا چاند سلطان نے ۲۵ سال حکمرانی کی۔ وہ مادری زبان گونڈی کے علاوہ عربی، فارسی اور اُردو سے واقف تھا۔[۱۱۱] چاند کی وفات کے بعد اس کا بھائی ولی شاہ نے اس کے بیٹے میر بہادر شاہ کو قتل کر کے تخت پر قابض ہوا تو اس کی بیوہ نے اپنے کمسن بچوں (برہان شاہ اور اکبر شاہ) کی حفاظت اور تخت کی واپسی کے لیے مرہٹہ سردار رگوجی بھوسلہ سے مدد مانگی۔ یوں رگھوجی نے حملہ کر کے تخت واپس لے لیا۔ بیوہ رانی نے خوش ہو کر رگھوجی کو تیسرا بیٹا تسلیم کیا اور ۱۷۳۷ء میں حکومت تین حصے میں منقسم کردی۔ یہاں سے ناگ پور میں رگھوجی کے ذریعے بھوسلہ دَور کا آغاز ہوا۔[۱۱۲] ۱۷۴۸ء میں رگھوجی نے برہان شاہ کو سالانہ پینشن دے کر تمام دیوگڑھ (اسلام گڑھ) کو اپنے حصے میں شامل کرلیا۔ رگھوجی اور اس اخلاف تقریباً ایک سو سال ناگ پور اور اس کے اطراف و جوانب میں حکمران رہے۔[۱۱۳] لیکن ۱۱ دسمبر ۱۸۵۳ء میں راجہ رگھوجی ثالث کی وفات کے بعد بھوسلہ حکومت کا چراغ گُل ہوگیا۔ کیوں کہ بدقسمتی سے راجہ رگھوجی ثالث لاولد فوت ہوا تو لارڈ ڈلہوزی نے مسئلہ الحاق کے تحت ۱۳ مارچ ۱۸۵۴ء کو ناگ پور کو انگریزی حکومت میں شامل کر کے مسٹر منسل کو یہاں کا کمشنر مقرّر کیا۔ پھر ۱۸۶۱ء میں ساگر، نربدا اور چھتیس گڑھ کے علاقے ناگ پور میں شامل کر کے اسے (سینٹرل پروانس) ایک صوبہ بنایا اور ناگ پور اس کا مرکز بنا اس صوبہ کے پہلے چیف کمشنر ای کے ایلٹ تھے۔[۱۱۴] اور یوں عہد بھوسلہ کے خاتمے سے (۱۳ مارچ ۱۸۵۴ء) مسلم معاشرہ منتشر ہوگیا اور پھر ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی نے ناگ پور کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ املاک تباہ و ضبط ہوئیں۔ لوگ فکرِ معاش میں علاقہ چھوڑ گئے جو موجود رہے وہ خوف و دہشت کی فضا میں جیتے رہے۔ یہ صورتِ حال ۱۸۶۰ء تک رہی۔[۱۱۵]

اس انتشار و ابتری کے ماحول میں مشرقی یوپی، خاندیش اور گجرات کے مسلم صنعت کار، دست کار اور تاجر معاش کے لیے ناگ پور آئے اور مستقبل سکونت اختیار کی۔ اسی اثناء میں اردگرد کے مسلمان نے بھی تجارت و ملازمت کی غرض سے سکونت اختیار کی۔ ان میں بوہرہ برادری، مومن برادری، میمن برادری، راعین برادری، منصوری برادری، قریشی برادری، چوڑی والے، تمباکو والے، راجھستانی دست کار شامل تھے۔[۱۱۶] اسی اثناء میں ناگ پور میونسپلٹی کے قیام (جنوری ۱۸۶۴ء) سے شہر کی ترقی کا دروازہ بھی کھلا۔ کالجز، اسکول، بازار، عجائب گھر بھی بنے۔ یوں قدیم و جدید کے آمیزش سے یہاں ایک مسلم معاشرے کی تشکیل ہوئی۔[۱۱۷] سیاسی جماعت کانگریس (۱۸۸۵ء) کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا بدلی تو ناگ پور کے لوگ ابتداً علی گڑھ تحریک اور سرسیّد کے حامی تھے لیکن پھر کانگریس کا دم بھرنے لگے۔ یہاں مسلمانوں کی بڑی تنظیم انجمن حامی اسلام تھی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف دشمنانہ کارروائی کی تھی اس لیے ہندوستان کے مسلمان مخالف ہوئے۔ مسلم اخبارات ''ہمدرد''، ''کامریڈ'' اور مولانا ظفر علی خان کے ''زمیندار'' نے انقلابی موڑ دیا اور یہاں لوگ تحریکِ خلافت کے حمایت میں ترکوں کی حمایتی بن گئے۔[۱۱۸] کانگریس کا سالانہ اجلاس ۲۶ دسمبر ۱۹۲۰ء کو ناگ پور میں ہوا۔[۱۱۹] مولانا ظفر علی خان نے تحریک خلافت کے ذیل میں یہاں دورے کیے۔ ۱۹۲۳ء تک ہندو مسلم دوستی عروج پر تھی لیکن بعد میں باقی ہندوستان کی طرح

یہ علاقہ بھی فرقہ پرستی کے لپیٹ میں آ گیا اور کئی قیمتی جانیں تلف ہوگئیں۔(۱۲۰) ناگ پور میں فرقہ پرستی کے زہر کو پھیلانے میں ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈ گیوار اور ڈاکٹر منجے نے نمایاں کردار ادا کیا۔(۱۲۱) پانچ سال نفرت کی فضا کے بعد سال ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کی آمد سے ہندو مسلم نے ایک ہو کر اس کا بائیکاٹ کیا۔(۱۲۲) اسی اثناء میں ناگ پور کے نواب صدیق علی خان مرکزی اسمبلی کے انتخابات ۱۹۳۴ء میں آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے جیت کر آئے اور بعد میں مسلم لیگ کے ممبر بنے۔ مسلم لیگ کو یہاں عروج ملا اس نے رضا کاروں پر مشتمل مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے نام سے تنظیم بنائی۔ بالآخر اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان ہندوستان کو انگریزوں سے آزادی ملی تو ناگ پور میں سیتا بلڈی کے تاریخی قلعہ پر ترنگا جھنڈا لہرایا گیا۔(۱۲۳)

موجودہ دَور میں بھارت کہ صوبہ مہاراشٹر کا شہر جو بھارت کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ ناگ ندی کے کنارے آباد یہ شہر بھارت کا تیرہواں اور دنیا کا ایک سو تیرہواں بڑا شہر سمجھا جاتا ہے۔(۱۲۴)

محمدؐ عربی کا غلام ہوجائے ۔۔۔ تو ناگ پور ابھی دارالسلام ہوجائے
خدا کے فضل سے ساعت وہ سر پر آ پہنچی ۔۔۔ کہ کام فتنہ گروں کا تمام ہوجائے

(نظم: ناگ پور، ۱۵ جون ۱۹۳۹ء، ص ۱۵۵)

۱۷۔ ہزارہ

پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ کا ایک ڈویژن ہزارہ ہے۔ ہزارہ ڈویژن سات اضلاع پر مشتمل ہے جن میں ہری پور، ایبٹ آباد، مانسہرہ، تورغر، بٹگرام، لوئر کوہستان اور اپر کوہستان کے اضلاع شامل ہیں۔ ہندکو، گوجری، پہاڑی کوہستانی اور پشتو یہاں کی بڑی زبانیں ہیں۔(۱۲۵)

ہزارہ شہر میں مسلم لیگ کے حامی اکثریت میں تھے جس کی وجہ سے انھیں الیکشن میں شاندار جیت نصیب ہوئی۔ مولانا ظفر علی خان نے اس جیت کے جشن کو نظم کے ذریعے منایا۔

جب جیت لیگ کی ہوئی اور کانگرس کی ہار ۔۔۔ روتی تھی سر پکڑ کے گورمنٹ ''خان'' کی
گاندھی بھی رو رہے تھے یہ کہہ کر کہ ہائے ہائے ۔۔۔ سرحد میں ناک کٹ گئی ہندوستان کی
اسلام نے ہزارہ میں اعلان کردیا ۔۔۔ فطرت کبھی بدل نہیں سکتی پٹھان کی
اُردو کو میں نے زندۂ جاوید کردیا ۔۔۔ ہندوستان میں دُھوم ہے میری زبان کی

(نظم: ہزارہ میں مسلم لیگ کی انتخابی فتح، ۱۴ جولائی ۱۹۳۸ء، دیوان: چ، ص ۱۲۹)

مولانا ظفر علی خان نے تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مسلم لیگ کو اسلامیانِ ہند کی نمائندہ جماعت بنانے اور اسے ہر سطح پر مربوط و منظم کرنے اور اس میں نئی رُوح پھونکنے کے لیے مختلف شہروں کے ہنگامہ خیز دورے کیے۔ بنگال سے لے کر سرحد و بلوچستان اور پنجاب، سندھ اور یوپی و بہار و بمبئی سے لے کر جنوبی ہند تک طویل اور پُرخطر سفر اختیار کر کے تحریک کا

پیغام گھر گھر پہنچانے کا فریضہ انجام دیا اوران کا یہ سفر مسلم لیگ کے لیے وسیلۂ ظفر بن گیا۔ ان علاقوں سے اپنی اُلفت ومحبت کا اظہار خوب صورت صوتی آہنگ میں کیا۔ ان نظموں میں ظفر علی خان نے مسلم لیگ کے جلسوں میں خطاب کرنے کے ساتھ ساتھ کارکنوں کی مجلس میں اپنے اشعار کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کے حوصلے بڑھائے۔ ان کی نظموں میں ان علاقوں کی محبت وسرشاری اور وارفتگی کا بیان پوری لطافت کے ساتھ موجود ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے چھوٹی بڑی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے مختلف علاقوں کے نتیجہ خیز دورے کیے۔ اس پورے سفر کے دوران جو انھوں نے مختلف عہد میں کیے، اس میں بہت سی ہنگامی، سیاسی نظموں کے علاوہ تاثراتی نظمیں بھی کہیں۔ مجالسِ احباب میں فرمائشی فی البدیہہ نظمیں کہیں۔ جنھیں مجموعہ چمنستان کی زینت بنا دیا گیا۔ ان نظموں میں زبان و بیان کی بے پناہ وُسعت نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس وقت کے سیاسی ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اپنی نظموں میں شہروں کے اسمائے معرفہ کے استعمال سے ثابت کر دیا کہ اُردو زبان برِّصغیر کی ایک تہذیبی وثقافتی زبان ہے۔ ان کی نظموں میں اسمائے معرفہ کا تذکرہ ان شہروں اور علاقوں کے محققین کے لیے سنگِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حواشی:

(۱) پروفیسر ڈاکٹر غلام حُسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان، حیات، خدمات و آثار، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۰

(۲) ایضاً، ص ۳۵

(۳) ایضاً، ص ۳۵

(۴) ایضاً، ص ۵۶

(۵) ایضاً، ص ۷۸

(۶) ایضاً، ص ۷۷

(۷) ایضاً، ص ۸۱

(۸) مولوی وحیدالدین سلیم، وضع اصطلاحات"، (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۴ء)، ص ۸۸

(۹) محمد سلیم چودھری، شعرائے امرتسر کی نعتیہ شاعری، (لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۴

(۱۰) ایضاً، ص ۱۵

(۱۱) ایضاً، ص ۱۶

(۱۲) ضلع امرتسر کی تاریخ، ۱۹۴۷ء تقسیمِ ہند، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، (اخذ شدہ تاریخ: ۱۶ فروری ۲۰۱۹ء)

(۱۳) ایضاً، محولہ بالا

(۱۴) مردورائے (Mirdu Rai)، *Hindu Rulers, Muslim Subject: Rights and the History of Kashmir* (پرسٹن یونیورسٹی پریس، جولائی ۲۰۰۴ء)، ص ۲۶۔۲۷۔۱۳۳

(۱۵) ڈاکٹر فوزیہ نذیر لون، جب کشمیر ''ایشیا کے سب سے بڑے بدمعاش'' کو پچھتر لاکھ روپے میں بیچ دیا گیا، مشمولہ: بی بی سی اُردو، بتاریخ ۱۷/اگست ۲۰۱۸ء، (اخذ شدہ تاریخ: ۱۶ فروری ۲۰۱۹ء)

(۱۶) ضلع امرتسر، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۷ مارچ ۲۰۱۹ء)

(۱۷) عظیم امرہوی، مرثیہ نگارانِ امروہہ، (کراچی: مہران پروسس، آؤٹ رام روڈ، حقانی چوک، ۱۹۸۴ء)، ص ۴۸

(۱۸) ایضاً، محولہ بالا، ص ۴۹

(۱۹) ایضاً، ص ۱۵

(۲۰) ایضاً، ص ۵۱

(۲۱) رئیس امرہوی، سادات امروہہ، مشمولہ مجلّہ شاہ ولایت ڈے (مطبوعہ پاکستان، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۱

(۲۲) مولانا محمد حسین آزاد، آبِ حیات، (لکھنؤ: اُتر پردیش اُردو اکادمی، ۱۹۹۸ء)، ص ۳۱۴

(۲۳) محمود احمد عباسی، تاریخ امروہہ، (عکسی ایڈیشن)، مرتّب و ناشر: حکیم ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، (نئی دہلی: نیو پرنٹ سینٹر، ۲۰۱۴)، ص ۲۵۶

(۲۴) عظیم امرہوی، مرثیہ نگارانِ امروہہ، (کراچی: مہران پروسس، آؤٹ رام روڈ، حقانی چوک، ۱۹۸۴ء)، ص ۵۳

(۲۵) ایضاً، ص ۶۶

(۲۶) ایضاً، ص ۷۷۔۵۳

(۲۷) ایضاً، ص ۱۲۴

(۲۸) امروہہ، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۶ فروری ۲۰۱۹ء)

(۲۹) بھاگل پور، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۳ مارچ ۲۰۱۹ء)

(۳۰) ایضاً

(۳۱) امر گرڑو، انڈیپنڈنٹ اردو، independenturdu.com (اخذ شدہ تاریخ: ۲۴ مارچ ۲۰۱۹ء)

(۳۲) ایضاً

(۳۳) بھاگل پور، محولہ بالا

(۳۴) ایضاً

(۳۵) Batala city in idia, wikipedia, https://g.co/kgs/p736v1 (اخذ شدہ تاریخ: ۱۵ جولائی ۲۰۱۹ء)

(۳۶) ایضاً

(۳۷) ایضاً

(۳۸) بٹالہ، انڈیا، بریٹانیکا https://www.britannica.com (اخذ شدہ تاریخ، ۱۸ جولائی ۲۰۱۹ء)

(۳۹) ایضاً

(۴۰) ایضاً

(۴۱) جھانسی، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۴ مارچ ۲۰۱۹ء)

(۴۲) ایضاً

(۴۳) ایضاً

(۴۴) The Editors of Encyclopaedia, Britanica, Article Lakshmi Bai Britannic.com (اخذ شدہ تاریخ:۱۱ فروری ۲۰۱۹ء)

(۴۵) حیدرآباد دکن، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ:۱۴ جون ۲۰۲۱ء)

(۴۶) سیّد حُسین، ”حیدرآباد دکن کا زوال“ تہذیب و زبان کا زوال تھا، ص۔۶۷ irak.pkltagldeecan.history (اخذ شدہ تاریخ ۱۷ جون ۲۰۱۹ء)

(۴۷) حیدرآباد دکن کی تاریخ، https:ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ:۱۴ جون ۲۰۱۹ء)

(۴۸) ایضاً

(۴۹) ایضاً

(۵۰) عمر خالدی، معین الدین عقیل (مرتبین)، مدح و قدح دکن، ادب و شعر میں تاریخ و تمدّن دکن کی چند جھلکیاں، ص۱۸

(۵۱) ایضاً

(۵۲) ایضاً، ص۲۵

(۵۳) دکن سلطنتیں، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https:ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ:۱۵ جون ۲۰۱۹ء)

(۵۴) ایضاً

(۵۵) عمر خالدی، معین الدین عقیل (مرتبین)، مدح و قدح دکن، ادب و شعر میں تاریخ و تمدّن دکن کی چند جھلکیاں، محولہ بالا، ص۲۵۔۲۷

(۵۶) ایضاً، ص۲۸

(۵۷) ایضاً، ص۲۹

(۵۸) ایضاً، ص۳۵

(۵۹) ڈاکٹر سیّد داؤد اشرف، بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد، (حیدرآباد دکن:۱۹۹۰ء)، ص۵۱

(۶۰) ایضاً

(۶۱) پروفیسر ڈاکٹر غلام حُسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان، حیات، خدمات و آثار، محولہ بالا، ص۴۰

(۶۲) ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زور، رُوحِ تنقید، (۱۹۴۰ء)، ص۲۵

(۶۳) حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی، ظفر علی خان اور ان کا عہد، (لاہور: اسلامک پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء)، ص۴۲۔۴۳

(۶۴) زمیندار، مؤرّخہ ۱۴ جولائی ۱۹۲۴ء

(۶۵) پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، (صدر دائرۃ المعارف الاسلام، پنجاب یونیورسٹی)، صنادید سندھ (باتصویر)، (احمد ربانی مطبع، نوائے وقت پرنٹرز، س ندارد)، ص۳۸

(۶۶) ایضاً، محولہ بالا، ص۳۸

(۶۷) ایضاً، محولہ بالا، ص۳۹

(۶۸) ایضاً، محولہ بالا، ص۴۰

(۶۹) ایضاً،ص ۴۰

(۷۰) ایضاً،ص ۴۱

(۷۱) ایضاً،ص ۴۴

(۷۲) اعجاز الحق قدوسی، تاریخ سندھ (سند)، جلد سوم، (لاہور: اپریل، اُردو سائنس بورڈ، اکتوبر ۱۹۸۴ء)، ص ۱۸۰

(۷۳) ایضاً،ص ۱۸۱

(۷۴) جانباز مرزا، تحریک مسجد شہید گنج، سیاسی، مذہبی اور تاریخی پس منظر میں (لاہور: بادامی باغ، مکتبہ تبصرہ گلشن کالونی، فروری ۱۹۸۸ء)، ص ۱۳۰

(۷۵) ایضاً،ص ۱۳۰

(۷۶) مسجد شہید گنج، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۸ فروری ۲۰۱۹ء)

(۷۷) جانباز مرزا، تحریک مسجد شہید گنج، سیاسی، مذہبی اور تاریخی پس منظر میں، محولۂ بالا، ص ۲۳۱

(۷۸) پروفیسر ڈاکٹر غلام حُسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان، حیات، خدمات و آثار، محولۂ بالا، ص ۲۵۱

(۷۹) ایضاً،ص ۲۵۴

(۸۰) عنایت اللہ نسیم سوہدروی، حکیم، ظفر علی خان اور ان کا عہد، محولۂ بالا، ص ۲۴۵

(۸۱) پروفیسر ڈاکٹر غلام حُسین ذوالفقار، مولانا ظفر علی خان، حیات، خدمات و آثار'' محولۂ بالا، ص ۲۵۴

(۸۲) ایضاً،ص ۲۶۰

(۸۳) کٹھیار، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۴ فروری ۲۰۱۹ء)

(۸۴) ایضاً

(۸۵) ایضاً

(۸۶) کشن گنج، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۳ جون ۲۰۱۹ء)

(۸۷) ایضاً

(۸۸) ایضاً

(۸۹) ایضاً

(۹۰) جاوید چودھری، مضمون ''کھاریاں''، javedch.com (اخذ شدہ تاریخ: ۲۰ جون ۲۰۱۹ء)

(۹۱) گوندل، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۶ مئی ۲۰۱۹ء)

(۹۲) ایضاً

(۹۳) لدھیانہ، https://ludhiana.nic.in، history district ludhiana (اخذ شدہ تاریخ: ۱۵ مارچ ۲۰۱۹ء)

(۹۴) ایضاً

(۹۵) ایضاً

(۹۶) ایضاً

(۹۷) ایضاً

(۹۸) ایضاً

(۹۹) Philip Lulgendor, (Professor of Hindi and Modern Indian Studies, University of Lowa), "Hanuman's Tale: The Message of Divine Monkey, Oxford University Press, ISBN, 978-019864220-4 wikipedia.com،(اخذ شدہ تاریخ:۱۶/اپریل ۲۰۱۹ء)

(۱۰۰) The Columbia Encyclopedia, Sixth Edition 2001-07, Faizabad Town, India, Bartleby.com،(اخذ شدہ تاریخ:۱۸/اپریل ۲۰۱۹ء)

(۱۰۱) ایضاً

(۱۰۲) ملک محمد نعیم بن عبدالکریم، ریاض النعیم یعنی تاریخ ملکِ صوبہ بہار ہندوستان، (کراچی: گلشن اقبال، سیّد محمد آلِ حسن ابراہیمی ۱۹۹۸ء)، ص ۲۳

(۱۰۳) ایضاً، ص ۲۳

(۱۰۴) ایضاً، ص ۲۲

(۱۰۵) ایضاً، ۱۴۔۱۵

(۱۰۶) ایضاً، ۲۴۔۲۵

(۱۰۷) ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، تاریخ ناگ پور (تحقیق)، (بمبئی: اُردو اکادمی، مہاراشٹر اسٹیٹ، ۱۹۸۳ء)، ص ۴

(۱۰۸) ایضاً، ص ۵

(۱۰۹) ایضاً، ص ۶

(۱۱۰) ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ناگ پور میں اُردو کا ارتقائی سفر، (بمبئی: اُردو اکادمی، مہاراشٹر اسٹیٹ، ۱۹۹۳ء)، ص ۸

(۱۱۱) ایضاً، ص ۸

(۱۱۲) ایضاً، ص ۹

(۱۱۳) ایضاً، ص ۹

(۱۱۴) ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ناگ پور کا مسلم معاشرہ (گونڈا اور بھوسلہ عہد میں)، (ناگ پور: علیم پرنٹرز، مومن پورہ، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۱

(۱۱۵) ایضاً، ص ۵۱ تا ۵۵

(۱۱۶) ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ناگ پور کا مسلم معاشرہ، عہدِ برطانیہ میں، ۱۸۵۴ سے ۱۹۴۷ء تک (ناگ پور: علیم پرنٹرز، حیدری روڈ، مومن پورہ، ۱۹۹۷ء)، ص ۳۲۔۳۳

(۱۱۷) ایضاً، ص ۲۳

(۱۱۸) ڈاکٹر رفیق زکریا، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، (س۔ن)، ص ۱۳۶

(۱۱۹) ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ناگ پور کا مسلم معاشرہ، عہدِ برطانیہ میں، ۱۸۵۴ سے ۱۹۴۷ء تک (ناگ پور: علیم پرنٹرز، حیدری روڈ، مومن پورہ، ۱۹۹۷ء)، ص ۶۴

(۱۲۰) ایضاً، ص ۶۹

(۱۲۱) ایضاً، ص ۰۷

(۱۲۲) دستاویز، ناگ پور نگر سنستھا شتابدی گرنتھ، سواتنستر سینک چتر کوس (کھنڈ ۲)، (مطبوعہ درشنیکا و بھاگ، مہاراشٹر راجیہ، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۱۶۔۱۱۷

(۱۲۳) ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ناگ پور کا مسلم معاشرہ، عہدِ برطانیہ میں، ۱۸۵۴ سے ۱۹۴۷ ء تک (ناگ پور: علیم پرنٹرز، حیدری روڈ، مومن پورہ، ۱۹۹۷ء)، ص ۸۱

(۱۲۴) ناگ پور، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۵ / اپریل ۲۰۱۹ء)

(۱۲۵) ہزارہ، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا، https://ur.m.wikipedia.org (اخذ شدہ تاریخ: ۱۴ / اپریل ۲۰۱۹ء)

مآخذ:

(۱) آزاد، محمد حسین، مولانا، آبِ حیات، لکھنؤ: اُتر پردیش اکیڈمی، ۱۹۹۸ء

(۲) امروہوی، عظیم، مرثیہ نگارانِ امروہہ، کراچی: مہران پروسس، آوٹ رام روڈ، حقانی چوک، ۱۹۸۴ء

(۳) اشرف، داؤد، سیّد، ڈاکٹر، بیرونی مشاہیر ادب اور حیدر آباد، حیدر آباد دکن: ۱۹۹۰ء

(۴) چودھری، محمد سلیم، شعرائے امرتسر کی نعتیہ شاعری، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۶ء

(۵) خالدی، عمر، عقیل، معین الدین (مرتبین)، مدح وقدح دکن، ادب و شعر میں تاریخ و تمدّن دکن کی چند جھلکیاں، حیدر آباد، امریکہ، کراچی: مجلسِ تاریخ دکن، ۱۹۹۳ء

(۶) زکریا، رفیق، ڈاکٹر، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، سن ندارد

(۷) ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، مولانا ظفر علی خان، حیات، خدمات و آثار، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

(۸) زور، محی الدین قادری، سیّد، ڈاکٹر، رُوحِ تنقید، حیدر آباد دکن: مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۹۳۰ء

(۹) ساحل، شرف الدین، محمد، ڈاکٹر، تاریخ ناگ پور (تحقیق)، بمبئی: اُردو اکادمی، مہاراشٹر اسٹیٹ، ۱۹۸۳ء

(۱۰) ـــــــــ، ناگ پور میں اُردو کا ارتقائی سفر، بمبئی: اُردو اکادمی، مہاراشٹر اسٹیٹ، ۱۹۹۳ء

(۱۱) ـــــــــ، ناگ پور کا مسلم معاشرہ، عہدِ برطانیہ میں، ۱۸۵۴ ء سے ۱۹۴۷ ء تک، ناگ پور: علیم پرنٹرز، حیدری روڈ، مومن پورہ، ۱۹۹۷ء

(۱۲) ـــــــــ، ناگ پور کا مسلم معاشرہ، (گونڈ اور بھوسلہ عہد میں)، ناگپور: علیم پرنٹرز، حیدری روڈ، مومن پورہ، ۱۹۹۶ء

(۱۳) سلیم، وحید الدین، مولوی، وضع اصطلاحات، پاکستان: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۴ء

(۱۴) سوہدروی، عنایت اللہ نسیم، حکیم، ظفر علی خان اور اُن کا عہد، لاہور: اسلامک پبلشنگ ہاؤس، نومبر ۱۹۸۲ء

(۱۵) شفیع محمد، مولوی، صنادید سندھ (باتصویر)، کراچی: نوائے وقت پرنٹرز، سن ندارد

(۱۶) قدوسی، اعجاز الحق، تاریخ سندھ (سند)، جلد سوم، لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۴ء

(۱۷) مرزا، جانباز، تحریکِ مسجد شہید گنج، سیاسی، مذہبی اور تاریخی پس منظر میں، لاہور: مکتبہ تبصرہ گلشن کالونی، ۱۹۸۸ء

(۱۸) نعیم، ملک محمد، ریاض النعیم یعنی تاریخ ملکِ صوبہ بہار، ہندوستان، کراچی: سیّد محمد آلِ حسن ابراہیمی، ۱۹۹۸ء

دستاویز:

(۱) ناگ پور نگر سنستھا شتابدی گرنتھ، سواتنستر سینک چتر کوس (کھنڈ ۲)، (مطبوعہ درشنیکا و بھاگ، مہاراشٹر راجیہ، ۱۹۷۶ء)

(۲) *The Columbia Encyclopedia*, Sixth Edition 2001-07, Faizabad Town, India

رسائل:

(۱) رسالہ معارف، شمارہ مئی، ۲۰۰۹ء، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی

برقی آخذ/ ویب گاہیں:

(1) bartleby.com
(2) b.b.c.urdu.com
(3) en.m.wikipedia.org
(4) https://ludhiana.nic.in
(5) https://ur.m.wikipedia.com
(6) https://www.britannica.com
(7) irak.pk|tag|deecan.history
(8) javed.ch.com
(9) https://ur.m.wikipedia.com
(10) https://ur.m.wikipedia.org|wiki